ذوالفقار احمد
متعلم پی ایچ۔ ڈی اُردو
یونیورسٹی آف سرگودھا

ڈاکٹر محمد یار گوندل
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
یونیورسٹی آف سرگودھا

اُردو داستان پر تنقیدی کُتب کا اجمالی تعارف

This article presents introduction on the critical literature on "URDU DASTAN". In this article, the researcher tried to study different books regarding the primary experience of dastan critics.Aleem-u-din Ahmed's "Urdu Zubanaur Fan-e-dastan goi" is an authentic book on the art of dastan. This book explains the elements and essentials of this particular art.Syed Waqar Azeem's "HamariDastanein" offers credible research material on various collections of narrative dastan. The tradition of criticizing dastans is not old. It started in 5th decade of 20th century. Now classical Urdu literature has a rich tradition of dastan critics. This article presents an introduction to prominent critical books on Urdu dastan.

داستان اُردو ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔البتہ اس پر تنقید کا عمل بعد میں شروع ہوا۔لیکن اس کے تخلیقی عمل میں تنقیدی شعور برابر کارفرما رہا ہے۔یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور میں داستانوی تنقید کے ابتدائی نقوش بھی ان داستانوں کے دیباچوں ہی میں ملتے ہیں۔داستانوی تنقید کے ضمن میں پہلی کوشش بدرالدین امان خان دہلوی کے ہاں بوستان خیال کے دیباچے کی صورت میں ملتی ہے۔جس کا سن تصنیف ۱۸۶۸ء ہے۔

داستانوی ادب کا عروج اور بیسویں صدی کا آغاز داستانوی تنقید کے سلسلے میں مہمیز ثابت ہوا اور داستانوں پر لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا۔داستانوی تنقید کے ابتدائی نقوش رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے داستانی مضامین میں نظر آتے ہیں۔ان مضامین میں تحقیقی اور تنقیدی مباحث مل جاتے ہیں۔اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ تنقید کی یہ ابتدائی کاوشیں آنے والی تنقید کی راہیں ہموار کرتی رہیں۔داستانوی ادب کے قبول

عام نے مہمیز کا کام کرتے ہوتے ناقدین کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس کے نتیجے میں داستانوی ادب کا بہت سا تنقیدی سرمایہ کتابی شکل میں سامنے آیا۔

داستانوی ادب کے اولین نقاد کلیم الدین احمد کی پہلی تنقیدی کتاب اُردو زبان اور فن داستان گوئی ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس لحاظ سے یہ تصنیف داستانوی تنقید میں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں پہلی بار داستان کے فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ داستان کی تنقید میں اُن کی یہ کتاب حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کاوش میں کلیم الدین احمد کی زیادہ توجہ داستان میں دلچسپی اور اس کے سریع الفہم ہونے پر ہے خواہ اُن کے مطالعے میں طلسم ہوش رُبا ہو یا دوسری کوئی مختصر داستان، قصے میں دلچسپی کے عنصر کو اہم خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ ہر واقعہ دلچسپ ہو، سب کچھ ہو، لیکن واقعات کی دلچسپی میں کمی نہ ہو۔۔۔ یہی ایک معیار ہے۔ جس سے ہر کہانی کی وہ جانچ کرتا ہے۔ جو کہانی اُس معیار پر پُورا اُترتی ہے۔ اُسے وہ اچھی قابل قدر سمجھتا ہے۔ اور جو کہانی اس معیار پر پُوری نہیں اُترتی۔ اُسے وہ کم قیمت خیال کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی ایک معیار ہے جس سے کہانیوں کے حُسن و قبح کی جانچ لازم ہے۔ اور یہ معیار محض طفلانہ نہیں۔ ہر فنی قصے میں دلچسپی کا وجود ضروری ہے۔ دلچسپی کا فقدان ادب میں اہم ترین عیب شمار کیا جاتا ہے"۔[۱]

داستانوی تنقید کے ضمن میں گیان چند جین کی کتاب اُردو کی نثری داستانیں اولین کاوشوں میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں تحقیقی نوعیت زیادہ اور تنقیدی کم ہے۔ گیان چند کی یہ کاوش اس اعتبار سے بھی قابل تحسین ہے کہ اس کے ذریعے انہوں نے اُردو داستان میں تحقیق اور تنقید کی راہ ہموار کی۔ اس میں اہم داستانوں کے تحقیقی مطالعے میں ماخذات تک رسائی حاصل کی ہے۔ دیگر داستانوں کے علاوہ داستان امیر حمزہ پر خاصا تحقیقی و تنقیدی مواد ملتا ہے۔ وہ داستان امیر حمزہ کی عظمت ان الفاظ میں واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''داستان امیر حمزہ نہ صرف اُردو داستان کے تقاضوں کو پُورا کرتی ہے۔ بلکہ ایپک کے کلاسیکی معیاروں پر بھی پُوری اُترتی ہے۔ یہ ایک ملت کی شادابی و بالیدگی کی کہانی ہے۔ اس کا مقصد عظیم ہے جس کے حصول کے لیے مُسلسل رزم آرائی کرنی پڑتی ہے۔ اس میں متعدد رومان شامل ہیں۔۔۔ طُول سے قطع نظر یہ داستان یورپ کے قدیم رومانوں کے مطالبات بھی پُورے کرتی

ہے۔ ان میں جنگ ،عشق اور مذہب کا تانا بانا ہوتا ہے۔ قصہ حمزہ میں ان تینوں عناصر کی فراوانی ہے"۔[۲]

اُردو فکشن کے ایک اور نقاد سید وقار عظیم کی معرکتہ الآرا تصنیف ہماری داستانیں موضوع کے لحاظ سے علیحدہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مصنف نے داستان کو کسی امتیاز کے سبب مضمون کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً باغ و بہار کا امتیاز قصہ گوئی واسلوب اور فسانہ عجائب کی خصوصیت اس کا انداز بیان اور لکھنو کے تہذیبی مزاج کی گہری چھاپ ہے۔ مصنف کے مشاہدہ کی گہرائی کے سبب زندگی کے متنوع پہلوؤں کی صحیح اور دلکش عکاسی کی گئی ہے۔ وہ جدت تخیل اور زور بیان سے ادبیت کے ایسے موزوں موتی پروتے ہیں کہ پڑھنے والا قافیہ اور مسجع کے شکنجے سے دل گرفتہ ضرور ہوتا ہے قافیہ کی عمدہ مثال ملاحظہ کیجیے" سر چوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا--- نسیم صبا کو سیدھا رستہ نہ ملا‘‘[۳]

داستانوی تنقید کے حوالے سے ۱۹۶۸ء کا سال ذرخیز ثابت ہوا۔ کیونکہ اس سال چند تنقیدی تصانیف سامنے آئیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۹۶۸ء میں باغ وبہار۔ ایک تجزیہ میں میر امن کے حالات زندگی معتبر حوالوں سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے باغ و بہار کے ماخذ پر بھی بات کی گئی ہے۔ اس کی زبان اور کرداروں کو بھی تنقید کا موضوع بنایاہے۔ میر امن کو داستان گوئی کے گُر سے خوب واقفیت ہے۔ زبان اور لہجے کی مدد سے داستان گوئی میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ ہر کردار کو اُس کے حسب رُتبہ مُنہ میں زبان دینے کی دسترس رکھتے ہیں۔ مصنف نے ہر طبقے کے ذخیرہ الفاظ، جملوں کی دروبست اور لہجے کے اُتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھا ہے۔ پہلے درویش کی ہمشیرہ متوسط گھرانے کی عورت ہونے کے باوجود اپنے چھوٹے بھائی کو کس خوش اسلوبی سے الوداع کہتی نظر آتی ہے۔

’’اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔۔۔۔۔لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے۔ اس کو لوگ طعنہ معنہ دیتے ہیں۔‘‘[۴]

اسی سال ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب دلی والے میرامن کی باغ وبہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ سامنے آئی۔ جس میں باغ و بہار پر متنوع مضامین شامل کتاب ہیں۔ جن میں تحقیق وتنقید

کے علاوہ تاریخی پہلو بھی واضح کیا گیا۔ مزید براں گیان چند کے مضمون "باغ و بہار کے محاسن" میں اس داستان کے محاسن گنوائے گئے ہیں۔ باغ و بہار پلاٹ کے لحاظ سے ناقص نہیں۔ فنی لحاظ سے درویشوں اور سگ پرست کی کہانیاں ضمنی ہیں۔ جبکہ قصہ کی جان یہی ہیں۔ پلاٹ سادگی اور وحدت کا حامل ہے۔ زبان کے لحاظ سے بھی باغ و بہار فوقیت رکھتی ہے۔ باغ و بہار کی اہمیت گیان چند کے ان الفاظ سے عیاں ہوتی ہے۔

''فارسی قطعے میں کہا گیا ہے۔ کہ شعر میں تین پیغمبر ہیں، فردوسی، انوری اور سعدی، کسی نے پُوچھا حافظ؟ جواب ملا وُہ تو خُدائے سخن تھا۔ یہی کیفیت میر امن کی ہے۔ میر اگر اہل زبان ہے تو امن خالق زبان۔ انہوں نے دلی کے قدیمی محلول کو کھنگال کر سخن کا آب حیات پیش کیا۔ بولی جس آب وتاب سے باغ و بہار میں جلوہ گر ہے دوسری جگہ نہیں۔''[۵]

احسان الحق اختر کی تصنیف سب رس کا تنقیدی جائزہ ۱۹۶۸ء میں ہی شائع ہوئی۔ اس میں سب رس کے قصے، کردار اور اسلوب کی بابت خوبیوں اور خامیوں سے پردہ چاک کیا گیا۔ صوفیانہ تمثیل کی حیثیت سے اس میں موجود نقائص کو سامنے لایا گیا ہے۔ سب رس کی تمثیلی داستان کا ہیرو دل حُسن کے مقابلے میں بُزدل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں مردانہ صفات کی کمی ہے اور وہ اسی سبب مجہول ومفعول ہو کر رہ گیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اجزائے افسانہ میں توازن اور تناسب کی کمی کا سبب پند ونصائح اور تقریروں کی بھر مار ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اس کے بیان میں ایک نقص ضرور ہے کہ ملا صاحب نے جگہ جگہ پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے۔ بیان اچھا ہے مگر قصے میں وعظ شروع ہونے کی وجہ سے قصے کا لطف کم ہو جاتا ہے۔ احسان الحق یہ کہنے پر مجبور ہیں:

''دراصل وجہی فن داستان طرازی سے ناواقف ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ داستان کی جان، تقریروں اور خطبوں میں نہیں۔ واقعات کی دلچسپی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قصے کو سبق آموزی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ استعمال اس وقت تک جائز ہے۔ جب تک قصے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اور قصہ گوئی تفنن طبع کی جگہ تکدر طبع کا باعث بن جاتی ہے۔ سب رس پر اس زاویے سے نظر ڈالی جائے۔ تو یہ داستان کم اور موعظہ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔''[۶]

زہرا معین کی تصنیف باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر

آئی۔ اس میں تنقید کے ساتھ ساتھ کرداروں کو زیر بحث لایا گیا۔ اس میں مرکزی، ذیلی اور فروعی کرداروں کے علاوہ نسوانی کردار بھی تنقید کا حصہ بنے۔ اس کتاب کی اہمیت پر ناقدین نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔فرمان فتح پوری کا خیال ہے:

''زہرا معین شاعرہ اور ادیبہ دونوں حیثیت سے جانی پہچانی ہیں۔ اُنہوں نے جب کُچھ لکھا ہے۔ پُوری چھان بین اور احتیاط سے لکھا ہے۔ ذمہ داری اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ ''باغ وبہار کا تنقیدی و کرداری مطالعہ'' زہرا معین کا بھر پور تنقیدی اور تحقیقی کام ہے۔ باغ و بہار کے کرداروں کا اب تک پوری طرح تحقیقی و تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ اب اس کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔ زہرا معین نے باغ و بہار کا مطالعہ جس زاویہ نظر سے کیا ہے۔ وہ بالکل انفرادی ہے۔ اس نے بعض ایسی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔ جس سے لوگ اب تک بے خبر تھے۔''۷

ارتضیٰ کریم کی عجائب القصص تنقیدی مطالعہ میں حسب ضرورت تحقیق اور صحت مندانہ تنقید کا رویہ اپنایا گیا۔ عجائب القصص ایک بادشاہ کی تصنیف ہونے کے باعث آداب سلطنت، شاہی رسوم ورواج اور دیگر شاہی لوازمات سے مملو ہے۔ اس داستان کے اسلوب کو تنقید کا حصہ بنایا گیا۔ عجائب القصص کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر کی اُردو نثر کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ جس میں قلعہ معلیٰ کی شُستہ و معیاری زبان استعمال کی ہے عجائب القصص کی حیثیت اُردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی ہے۔ اس کی زبان واسلوب کا پرتو بعد کی نثری تصانیف میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ارتضیٰ کریم کی تنقید اور تنقیدی رویے پر معقول اور مستند رائے دی ہے:

''ارتضیٰ کریم نے سوچ بچار کے بعد اپنے لیے اس میدان کا انتخاب کیا ہے وہ اس راہ کی د شواریوں سے آشنا ہیں۔ اس کتاب میں جس سنجیدگی سے انہوں نے عجائب القصص کی تہذیبی اور ادبی خصوصیات کا تجزیہ کیا ہے اور جو طرز استدلال اپنایا ہے۔ اس سے ان کی طبیعت کی سلامتی اور روشنی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر محبت اور اعتدال کے راستہ سے اُن کے قدم نہ ڈگمگائے۔ تو اُمید ہے فکشن کی تنقید اُن کے ہاتھوں تعمیر وترقی کے نئے منطقے دیکھے گی۔''۸

۱۹۸۷ء کا سال داستانوی تنقید کے لیے بار آور ثابت ہوا کیونکہ اس سال تین کُتب سامنے آئیں۔ سُہیل

بخاری کی تنقیدی تصنیف اُردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) معیاری تصنیف ہے۔اس میں تحقیق وتنقید شانہ بشانہ چلتی ہے۔مصنف کا اپنی تصنیف کے متعلق یہ دعویٰ ہے:

''اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان داستانوں کے علاوہ جن کا ذکر عام طور سے دوسری کتابوں میں ملتا ہے پچیس تیس داستانیں ایسی ہیں۔جن کا صرف نام ہی نام سُننے میں آیا ہے۔اُن کی تفصیلات نہیں ملتی تھیں۔تقریباً بیس پچیس داستانیں ایسی ہیں۔جو پہلی بار منظر عام پر آرہی ہیں۔''۹

سُہیل احمد خان کی انتخاب مضامین پر مشتمل کتاب داستان درداستان ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔اس میں وہ مضامین شامل ہیں جو داستانوں کی ظاہری و باطنی معنویت کے حامل ہیں۔اگر کسی ایک تنقیدی طریق کار کے حوالے سے ایک سے زیادہ مضامین دستیاب تھے تو اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا۔ جیسے وہ کہتے ہیں کہ نفسیاتی اور جنسی حوالوں سے بہت سے ناقدین نے لکھا ہے مگر اختر احسن نے مضمون "مثنوی گلزار نسیم "میں اس کا مربوط تجزیہ کیا ہے۔اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔شمیم حنفی کا مضمون " کتھا سرت ساگر" تنقیدی نوعیت کا ہے۔شمیم حنفی نے کہانیوں کے اس سمندر میں مشرقی تخیل کی وہ رمز ڈھونڈ نکالی ہے جس کی گرفت میں آنے والی ہر سچائی بڑی سچائی کا حصہ ہے۔کتھا کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے بھی بات کی ہے اور اُسے اس عہد کی تاریخ کا ترجمان کہا ہے۔وہ اس کے اُسلوب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''جو بات اس بے مثال کارنامے کو ہمارے لئے آج بھی با معنی بناتی ہے۔ایک تو اس کا خارجی اُسلوب اور فارم ہے کہ ایک گرہ کھلتی ہے تو سوئی گرہیں سامنے آموجود ہوتی ہیں چنانچہ اسے ختم کرنے کے بعد بھی ہمارا اس سے تعلق رہتا ہے۔''۱۰

سُہیل احمد خان کی دوسری تصنیف داستانوں کی علامتی کائنات ہےاس میں داستان کی تمثیلی ، علامتی اور استعاراتی سطح کے متعلق بات کی گئی ہے۔جس نہج پر جا کر داستانیں حکمت اور تربیت نفس سے مربوط ہو جاتی ہیں۔کتاب میں حاتم کے ساتوں اسفار کی معنوی باطنیت سامنے لائی گئی ہے۔حاتم کا سفر علامتی سطح پر اپنے وجود کی پہچان کا سفر ہے۔پہلی منزل "وادی طلب" ہے اس میں وحدت اور اپنے وجود کی تلاش کی منزل ہے۔جو منطق الطیر میں سیمرغ کی تلاش وجستجو کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

''حاتم کا پانچواں سفر کوہ ندا کا سفر ہے۔حاتم کی تمام مسافتوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ

شروع کے مراحل میں رموز سادہ تھے مگر آگے چل کر پیچدار ہوتے چلے جاتے ہیں۔تصوف کے حوالے سے یہ عالم خلق سے عالم امر کی طرف جانے کی صورت ہے۔'کوہ ندا' کی رمزیت بڑی معنی خیز ہے اس سفر میں حاتم جگہ جگہ موت سے متعلق عجیب رسمیں دیکھتا ہے۔''[۱۱]

شفیق احمد شفق کی تصنیف اردو داستانوں میں ویلن کا تصور موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے۔اس میں داستان پر تنقید کے حوالے سے نیا در وا کیا گیا ہے مصنف نے خود،، پیش لفظ ،، میں لکھا ہے۔

''میں نے اس مقالے میں کپاس کات کر دھاگہ اور ململ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یہ وہم نہیں کہ میں نے ڈھاکہ کا ململ بنالیا ہے۔اس موضوع پر یہ میری ابتدائی کوشش ہے۔''[۱۲]

آغا سہیل کی تصنیف دبستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقا ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی ۔ اس میں لکھنو کی نمائندہ داستانو ں کا داستانی ادب میں ارتقا کے ذیل میں کردار واضح کیا گیا ہے۔ طلسم ہوش ربا کے متنوع پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔طلسمات اور مہمات کی داستانوں میں معتبر اور طلسمات و سحر کے ضمن میں اس داستان کو شہنشاہ گردانا گیا ہے۔ڈاکٹر آغا سہیل طلسم ہوش ربا کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

''اردو داستان میں رزم و بزم، عیاری اور طلسمات کی ہزار ہا تصاویر دیکھتے آ رہے ہیں ۔لیکن کیا زبان و بیان اور طرز تحریر کی دلکشی کیا رزم و بزم آرائی ہے، کیا عیاری اور چالاکی ، ہر لحاظ سے طلسم ہوش رُبا کا پلہ سب داستانوں پر بھاری ہے۔''[۱۳]

آرزو چودھری کی تخلیق داستان کی داستان داستانوی تنقید کے ابتدائی آثار میں شامل ہے۔اس میں دیگر ممالک کی اساطیر اور داستانوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا۔یہ تصنیف تحقیق و تنقید کے علاوہ قصہ کی تاریخ بھی رکھتی ہے ۔اس میں داستان کی تشکیل و تعمیر کے علاوہ اس کے شباب و زوال کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ آخر میں مسلمانوں نے داستان کو کس حد تک فروغ دیا اس پر مدلل بحث ہوئی ۔مصنف کے خیال میں کلاسیکی ادب میں منظوم قصوں کی تخلیق پہلے ہوئی۔ اسی سبب ہر خطہ زمین پر قدیم ادب میں منظوم قصے اور کہانیاں پیش پیش رہی ہیں۔مصنف نے ''پیش از داستان'' میں اپنی کتاب کے بارے میں کہا ہے:

''ان داستانوں کے گیسو و عارض اور سہانا جمال وقت کی دھول میں اٹا پڑا تھا چنانچہ میں نے کا

وشوں کی مصفا شبنم میں اپنے فکر کی سنہری اور سجل دھوپ گھول کر انہیں دھویا اور پھر شعور کی ابٹن کی مہکتی چاندنی سے اُن کے انگ انگ کو تازگی اور جلا بخشی۔ اب یہ اپنی تمام آب و تاب اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ آپ کے روبرو ہیں۔اور دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔'' [۱۴]

ڈاکٹر سلیم اختر کی تصنیف داستان اور ناول تنقیدی مطالعہ میں داستان کے متعلق گنتی کے چند مضامین ہی سہی مگر کیفیت کے اعتبار سے قابل قدر ہیں ۔سلیم اختر نے فکشن کے ناقدین کی قلت کے اسباب گنوائے ہیں۔جن میں سے ایک یہ ہے کہ اردو میں جو فکشن تحریر ہو رہی ہے اس کا خاصا حصہ بے جان اور بے کار ہوتا ہے۔اس لیے اپنے وقت کو موزوں طور پر استعمال کرنے والا نقاد بری فکشن پڑھنے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ فکشن کی تنقید اس لیے بھی کٹھن ہے کہ نقاد کے لیے فکشن کا پس منظر، مصنف کا مطمع نظر، فنی مقاصد اور طرز احساس کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔آخری مضمون "باغ و بہار کے درویش عاشق" میں سلیم اختر نے باغ و بہار کے درویش عاشقوں کا میر کی غزل کے پس منظر میں مطالعہ کرتے ہوئے ان درویشوں کا کردار غزل کے روایتی عاشق سے مشابہ ٹھہرایا ہے۔ یہ مشابہت متعدد مواقع پر ظاہر کی ہے۔ مصنف کے ہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ میرامن میرتقی میر سے واقعی اس حد تک متاثر تھے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر کلیات میر کی معاونت سے اپنی کتاب کو باغ و بہار بنا گئے۔سلیم اختر خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ مختلف نامور شعرا نے طرز میرا ختیار کرنے کی سعی کی ۔مگر میر کا انداز نصیب نہ ہونے پر ناکامی کا اعتراف کیا۔اُن کا خیال ہے۔

''۱۸۰۰ء تک دبستان لکھنو کے نامور شعرا کا کلام بھی سامنے آچکا تھا مگر میر کی غزل زندہ وتابندہ تھی۔اور میرامن ایسا شخص جو دلی پر ناز کرتے ہوئے وہاں کا روڑا ہو کر رہنے کو باعث فخر تصور کرتا ہو۔اس کا میر سے خصوصی تاثر قبول کر کے درویشوں کی اس داستان میں میر کے درویش صفت عاشق سے کچھ رنگ مستعار لے لینا بعید از قیاس نہیں۔'' [۱۵]

رفیع الدین ہاشمی کی تصنیف سرور اور فسانہ عجائب میں سرور کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فسانہ عجائب کے متعدد پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا اور فسانہ عجائب کے اُسلوب کی خوبیاں گنوائی گئیں ۔مثلاً قافیہ پیمائی ،تلمیحات ، اشعار کا استعمال ،تکرار لفظی، مترادفات اور ضرب الامثال کا برمحل استعمال ،سرور کی نثر دقیق و نامانوس الفاظ سے پاک ہے مثلاً " شہزادہ گھوڑے سے اُترا، سیدھا ملکہ کے پاس گیا" ۔مزید برآں فسانہ عجائب کی قدر و قیمت واضح کی گئی۔متنوع خصوصیات فسانہ عجائب کو طلسم ہوش رُبا

اور بوستان خیال جیسی داستان سے ممتاز کرتی ہیں۔

''پہلی تو اس کا اختصار۔۔۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ (سرور) گردوپیش کے ماحول سے بھی متاثر ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف قاری سے زیادہ زبان واسلوب پر توجہ دیتا ہے۔''[۱۶]

ڈاکٹر عفت زریں کی تصنیف فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں: ایک تہذیبی مطالعہ میں تہذیب کے مفہوم و معانی اور اس کی جہات کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹا گیا ہے۔ سات کا عدد تہذیبی قرار دیا گیا ہے۔اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کی چار مخصوص نثری داستانوں میں سے تہذیب و معاشرت کے پہلوعیاں کیے گئے۔باغ و بہار کے تیسرے درویش کی سیر میں تہذیب و معاشرت کا لازمی عنصر واضح کیا گیا۔

''درویش نے دروازہ بند نہ رکھا ایک بڑھیا دروازہ کھلا پا کر اندر چلی آئی ہے۔ اور سامنے کھڑی ہو کر دُعائیں دینے لگی۔ بیٹی کے بچہ ہونے کا عُذر کیا۔ زچہ کو سٹورا اور اچھوانی دینے کی توفیق نہیں۔۔۔،شہزادی فریب میں آئی۔ چار نان اور کباب کے علاوہ انگوٹھی چھنگلیا سے اُتار کر حوالے کی۔''[۱۷]

مذکورہ بالا واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زچہ کے لیے زچگی کے بعد یہ چیزیں اُس وقت بھی اُتنی ہی ضروری تھیں جتنی کہ آج۔ عفت کی تصنیف بلحاظ موضوع خاص اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ مصنفہ نے بلحاظ موضوع تشنگی کو بھرپور انداز میں پورا کیا۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کی کتاب داستانیں اور مزاح اپنی نوعیت اور موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس میں تحقیقی نکتہ نگاہ سے نثری اور منظوم داستانوں سے مزاح کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً داستان عجائب القصص میں دلچسپی کے دیگر لوازمات کے ساتھ مزاح کا عمل دخل بھی ہے۔ دیو کا مضحک حلیہ یوں پیش کیا گیا۔

''ایک دیو سفید جس کا قد کا طول پچاس گز کا اور سر برابر قلعہ زنگ بار کے ہے۔ اور آنکھیں اس کی مثل منقل کے مشتعل ہیں۔ اور دہان اس کا مثل دہان حمام فراخ اور شعلہ زن ہے اور ہر ایک دانت اس کا طول اور عرض میں دو دو گز کا اور تیز تر سُو ہان اور شمشیر ہے''[۱۸]

آرزو چودھری کی تصنیف "عالمی داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) ۱۹۹۵ میں منصۂ شہود پر آئی۔ پیش لفظ میں لکھا ہے کہ عالمی داستان سے مراد کلاسیکی داستان ہے "پیش داستان" کے آخر میں اس

تصنیف کی افادیت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''عالمی داستان اردو لٹریچر میں اولین کاوش ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ دنیا کی کسی زبان یہاں تک کہ انگریزی زبان و ادب بھی اس کی تمام تر وسعتوں اور ہمہ گیریوں کے باوصف تا حال اس نوعیت کی کوئی تصنیف نہیں۔''[۱۹]

اس کتاب میں عالمی داستان کو مختلف مما لک کے حوالے سے مطالعہ تحقیق و تنقید بنایا گیا۔ یہ تنقیدی کاوش عالمی ادب کے محققین اور مورخین کے لیے بھی حوالے کا کام دے گی۔

پروفیسر صغیر افراہیم کی کتاب نثری داستانوں کا سفر اور دوسرے مضامین تنوع اور رنگارنگی کا حامل مجموعہ مضامین ہے۔ اس میں داستان کی ذیل میں تحریر کیے گئے مضامین مقدار میں کم ہونے کے باوجود معیار میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مضامین تحقیقی وتنقیدی ہونے کے علاوہ نثری داستانوں کی ایک لحاظ سے تاریخ بھی ہیں۔ یہ کاوش مصنف کے علمی ذوق اور تجسس کی عمدہ مثال ہے۔ کتاب کا اہم مضمون ''طلسم ہوش رُبا۔ ماضی تا حال'' میں داستان کے متنوع پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اُردو زبان اور فن داستان گوئی میں طلسم ہوش رُبا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔

''ہر زبان میں اساطیر اور داستانوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ شعرا اور انشا پرداز اس ذخیرے کی قیمتی چیزوں کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ قدیم داستانوں، اعتقادوں سے بھی عقبی زمین کا مصرف لیتے ہیں۔ انہیں نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اور بے شمار نقوش اور تشبیہوں سے اپنی عبارت کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ یونانی اساطیر، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں اور ان کی دلچسپ کہانیوں کا اثر یورپ کے ہر ادب میں نمایاں ہے۔ اردو میں داستان امیر حمزہ اور خصوصاً طلسم ہوش رُبا سے یہی مصرف لیا جا سکتا ہے۔''[۲۰]

ڈاکٹر شاہد حسین کی تصنیف قصہ مہر افروز و دلبر تنقیدی و تہذیبی تجزیہ ۱۹۹۸ میں شائع ہوئی۔ وہ قصے کی زبان، تقابلی تاریخ اور لسانیاتی مطالعہ، سماجی رشتوں اور ان کی شکست و ریخت کے سبب قصہ مہر افروز و دلبر کو بہترین قصہ قرار دیتے ہیں۔ قصہ مہر افروز کے اجزائے ترکیبی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ قصہ کے تنقیدی جائزہ سے قبل تحقیق کی گئی ہے۔ جس میں مستند ماخذات اور موقر ناقدین کی آرا شامل کی گئی ہیں۔ شاہد حسین نے اپنی تصنیف میں لسانی وتہذیبی مطالعہ کرتے ہوئے ماضی کی تہذیب آنکھوں کے سامنے چلتی

پھرتی دکھائی ہے۔شہزادے کی پیدائش کا منظر اُس وقت کی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔

''بادشاہ بہت خوش ہوتے ہیں اور فرمایا کہ تین کوس اس جگہ سے شہر ہے۔تس میں ہمارے محلوں تائیں تمام زربفت وبادلہ کے پا انداز بچھا جائے۔سب جو ساتھ کے ہمارے لوگ ہیں۔سو اسی کے اوپر ہو کے چلے آویں۔۔۔۔۔۔ہجوم اتنا ہوا تھا۔کہ نذر اور نچھاور کرنے کو لوگ نزدیک نہ پہنچ سکتے تھے۔خوش وقتی میں دور ہی سے پھینکتے تھے۔''۲۱

''اردو کی زندہ داستانیں''ڈاکٹر مظفر عباس کی مختصر تنقیدی کتاب ہے۔اس میں داستان کے فن اور چند داستانوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔جس میں سب رس ،باغ و بہار اور فسانہ عجائب ہیں۔ان داستانوں پر تنقیدی مباحث قلم بند کرتے ہوئے ضخامت سے اجتناب کیا گیا ہے۔انہوں نے تنقید کو معتبر اور باوزن بنانے کے لیے ناقدین کی آرا کا سہارا لیا ہے۔افسانوی نثر کا پس منظر، پیش منظر اور داستان کا فن مختصر بیان کرتے ہوئے نمائندہ داستانوں کی جزئیات کو تنقیدی بصیرت سے سمیٹا ہے۔ڈاکٹر روبینہ ترین کی رائے زیر نظر کتاب کے متعلق کتاب کے پشت فلیپ پر اس طرح تحریر ہے۔

''ڈاکٹر مظفر عباس اردو کے وہ اہم نقاد ہیں۔جنھوں نے اپنے ذوق وشوق ،محنت اور لگن سے اردو کی ہر صنف کا نہ صرف مطالعہ کیا۔ بلکہ اسے ایک منزل تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ۔زیر نظر کتاب بھی ان کے داستانوی ادب کے مطالعے کی ایک بہترین مثال ہے۔اردو اور اس کی ادبیات کی مزاج شناسی ، افکار اور فنون کا گہرا مطالعہ ان کا بہترین تجزیہ اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مظفر عباس نے صرف اردو کی تین اہم داستانوں (سب رس، باغ وبہار،فسانہ عجائب) کو ہی اکٹھا نہیں کیا بلکہ دکن ،دہلی اور لکھنؤ کے لسانی تہذیبی وثقافتی رنگوں کو بھی مجتمع کر دیا ہے۔''۲۲

ساحری ،شاہی ،صاحب قرانی ،داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول نظری مباحث کے مصنف شمس الرحمٰن فاروقی ہیں ۔اردو کی معروف داستان پر یہ تنقیدی کاوش موضوع کے لحاظ سے اولین ہے۔اس میں داستان کے زبانی بیانیہ ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ان کے نزدیک دراصل داستان ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لئے تصنیف کیا جائے چاہے فی البدیہہ ہو خواہ غور و فکر کے ذریعے سے ۔یعنی جو بھی طریقہ تصنیف ہو لیکن مقصود ایک ہی ہو کہ بیانیہ کو زبانی سُنایا جاے اُس کی رسومات اور لوازمات بھی زبانی بیانیہ کے

ہوں گے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں :

’’اُردو کی داستان امیرحمزہ زبانی بیانیہ کی اعلیٰ ترین مثالوں میں تو ہے ہی ۔لیکن چونکہ یہ لکھی ہوئی بھی موجود ہے۔اس لیے اسے دُنیا کے طویل ترین اور تحریری بیانیوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ زبانی بیانیہ بھی بڑا ادب ہوسکتا ہے۔ والمیکی کی "رامائن "اور ہومر کی "ایلیڈ " اور "اوڈیسی"۔ زبانی بیانیہ ہی کی صورت میں وجود آئے تھے ۔۔۔نولکشوری داستان امیرحمزہ کی چھیالیس جلدیں مجموعی طور پر اس بات کا پورا استحقاق رکھتی ہیں کہ اُنہیں بڑا ادب کہا جائے۔‘‘[۲۳]

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی کی تصنیف طلسم ہو ش رُبا :تنقید و تلخیص میں داستان کے فن پر تنقیدی مباحث نذر قلم کیے گئے اور داستان کی تلخیص بھی معرض تحریر میں لائی گئی ۔اس میں تحقیق زیادہ اور تنقید کم ہے۔ تحقیق کے ضمن میں بڑی نکتہ رسی اور محنت سے شواہد اکھٹے کیے ہیں ۔داستان کے فن پر تنقید کرتے ہو ئے عبدالعلیم شرر کے بتائے ہوئے چاروں عناصر پر تنقیدی نظر ڈالی گئی۔فریدی کی تیار کردہ تلخیص میں طلسم ہوش رُبا کی زبان کا لطف پوری طرح موجود ہے ۔اس تلخیص کی ضرورت اور داستان طلسم ہوش رُبا کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نورالحسن نقوی نے لکھا ہے:

’’ہمارے بزرگوں کی معاشرت، ان کے معتقدات ۔ان کے خیالات ومحسوسات، ان کے زمانے کے طرز تکلم ،اس دور کی زبان کے تمام رنگ، تمام رُوپ ۔ داستان کی اس ایک دنیا میں کتنی بہت سی دنیائیں آباد ہیں ۔وسیع اور ناپید کنار، ہماری داستانوں میں شاید سب سے اہم ہے، داستان امیرحمزہ اور طلسم ہوش رُبا اس گلستان کا گل سر سبد ۔۔۔ضرورت تھی ایک ایسی تلخیص کی ۔جس میں قصہ بھی برقرار رہے ۔اورکوئی ایسا حصہ چھوٹنے نہ پائے ۔ جو زبان و بیان فن داستان گوئی یا معاشرت کی تصویر کشی کے نقطہ نظر سے اہم ہو۔ اس بے حد مشکل کام کے لیے انتظار تھا۔ ایک ایسے ذی علم، با ذوق اور جفاکش صاحب قلم کا۔ جو ان ہزاروں صفحات کو ہزار بار پڑھے، اہم حصوں کا انتخاب کرے۔ اور اُنہیں اس ہنرمندی سے جوڑے کہ پیوندکاری کا شائبہ تک نہ ہو، ساتھ ہی اس داستان کو تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کا حق بھی ادا کرے۔ اُردو ادب کی یہ اہم خدمت ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی کے نصیب میں تھی ۔اُنہوں نے یہ کام ایسے سلیقے سے کردکھایا۔کہ آئندہ کسی کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔‘‘[۲۴]

ڈاکٹر ابن کنول کی تخلیق داستان سے ناول تک (اردو کی نثری داستانیں) میں نثری داستانوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔جس میں اُن کے مآخذ پر بات کرتے ہوئے داستان کے فن اور اسلوب کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں مضامین کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔''بوستان خیال'' پر بیشتر مضامین ہیں۔مضمون "بوستان خیال کا لسانی مطالعہ" میں اسلوب کی خوبیاں گنوائی گئی ہیں۔ضرب الامثال فارسی زبان کی ہیں مثلاً "ہر فرعون را موسیٰ۔" سج و مرصع نثر کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور استعاروں سے زبان کو مزین کیا گیا مثلاً "ہر ایک کے طائر ہوش نے قفس سے پرواز کی"۔اسی زبان کے سبب بوستان خیال کے مرتبے کے بابت مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں۔

''ایک ادبی کارنامے کی حیثیت سے بوستان خیال کا مرتبہ داستان امیر حمزہ سے بلند تر ہے۔کیونکہ اس کے اُسلوب اور زبان میں ادبی خصوصیات زیادہ ہیں۔''[۲۵]

سید قدرت نقوی کی تصنیف سب رس ایک مطالعہ میں داستان سب رس کی اہمیت کے چند اسباب گنوائے گئے ہیں۔ مثلاً اُسلوب نگارش، قصہ کا انوکھا پن، انداز اور زبان وغیرہ۔ اس کے علاوہ توضیحات کو دلچسپ اور دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا۔تسامحات سب رس کو بھی سامنے لایا گیا۔

ڈاکٹر ابن کنول کی تصنیف بوستان خیال ایک مطالعہ دوحصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تحقیقی وتنقیدی اور تاریخی امور کا حامل ہے۔ دوسرا حصہ تہذیبی اقدار پر مشتمل ہے۔ ابن کنول نے ماضی کی تہذیبی قدروں کو بوستان خیال کے تناظر میں ترتیب دینے کی سعی کی ہے۔مصنف کے نزدیک بوستان خیال کا سب سے اہم ترجمہ خواجہ امان دہلوی کا ہے۔اسی ترجمہ کے سبب "بوستان خیال " جیسی قابل قدر داستان کی رسائی اُردو والوں تک ہوسکی۔ابن کنول نے بوستان خیال اور ماضی کی تاریخ کے تہذیبی مرقعوں کا تقابل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔کہ بوستان خیال محض ایک تخیلی داستان نہیں بلکہ تہذیبی تاریخ ہے۔

داستان امیر حمزہ کی ذیل میں شمس الرحمٰن فاروقی کی دوسری تنقیدی تصنیف ساحری، شاہی ،صاحب قرانی ،داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد دوم عملی مباحث " ہے۔یہ عملی تنقید کی جانب اہم قدم ہے۔کیونکہ اس میں داستان پر عملی مباحث کا جو کام ہے وہ اس سے قبل معدوم ہے۔باب اول میں داستان کے دفاتر اور جلدیں نذر قلم کی گئی ہیں۔ترتیب کے سلسلے میں فاروقی سب سے اچھی ترتیب اُسے گردانتے ہیں۔جو واقعات قصہ کے وقوع کے لحاظ سے یعنی (chronological order) کا

خیال رکھ کر بنائی گئی ہو۔ یہ کتاب تنقیدی ڈھنگ کے لحاظ سے جداگانہ انداز کی حامل ہے۔شمس الرحمٰن فا روقی کی داستانوی تنقید کے ضمن میں تیسری تصنیف "ساحری، شاہی، صاحب قرانی، داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد سوئم جہان حمزہ "۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔تمہید میں لکھا ہے کہ اس جلد میں بعض اہم واقعات، کردار اور خصوصیات ادبیہ و بیانیہ کو مختصر فرہنگ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے جن جن داستانوں کو بطور حوالہ استعمال کیا ہے، اُن کی فہرست بلحاظ الف بائی تحریر کی ہے۔ جہان حمزہ مو ضوع اور مواد کے اعتبار سے معلومات افزا ہے۔داستان امیر حمزہ اور اس کے مصنفین کی بابت معلومات دی گئی ہیں۔

سید ضمیر حسن دہلوی کی کتاب" فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ "۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ۔مقدمہ میں مصنف اپنی تصنیف کا مقصد فسانہ عجائب کو حقیقی مرتبہ سے روشناس کرانا بتاتے ہیں۔فسانہ عجا ئب کی کردارنگاری، مکالموں، منظر نگاری اور زبان وبیان کے حوالے سے بات کی ہے۔اس کے علاوہ فسانہ عجا ئب کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر واضح کیا گیا ہے۔یہ تصنیف اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں لکھنو کی نمائندہ داستان کا مجموعی طور پر تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے" فسانہ عجائب" کا ادبی اور تاریخی مرتبہ ناقدین کی آرا کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔فسانہ عجائب پر منصفانہ رائے دیتے ہوئے وقار عظیم نے لکھا ہے۔

''فسانہ عجائب ایک ایسی طرز میں لکھی گئی ہے۔جواس زمانے میں اور اس خاص ماحول کا پسندیدہ طرز ہے۔لیکن اس طرز خاص میں سرور کی شخصیت کا رنگ ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔اور اس نے بہت سے عیبوں کے باوجود اس میں بعض امتیازات پیدا کیے ہیں ۔۔۔لیکن ان عجیب الخلقت باتوں میں زندگی کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس نے فسانہ عجائب کو دوسری داستانوں میں تفوق دیا ہے۔اسکے بقاء میں مصنف کے غیر معمولی مشاہدہ، ماحول سے گہرے ربط، اس کے فطری مزاج اور لطافت طبع کو بڑا دخل ہے۔''[۲۶]

سید وقار عظیم کی تصنیف داستان سے افسانے تک میں داستانوں کا مقصد بتاتے ہوئے داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے پیرائے ظاہر کئے گئے۔یہ کتاب داستانوی تنقید میں بنیادی حوالہ رکھتی ہے۔داستا ن کے حوالے سے اس میں تھوڑے مضامین ہیں مگر مواد کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔سید وقار عظیم نے فکشن کا عمیق نظری اور ژرف نگاہی سے جائزہ لیا۔اُن کا خیال ہے

''زمانے نے فنکار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا۔ جو رومان کی رنگینیوں کے بجا
ئے زندگی کی سادہ وپُر پیچ حقیقتوں کی حامل ہو۔۔۔زمانے کی اسی طلب اور تقاضے نے ناول کی
تخلیق کی اور آہستہ آہستہ اس نے داستان کی جگہ لے لی ۔۔زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسا
ن کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔''۲۷

ڈاکٹر علی جاوید کی کتاب اُردو کا داستانوی ادب متنوع مضامین کا مجموعہ ہے یہ مجموعہ رنگا رنگی کے سبب مواد اور معلومات کا بیش بہا خزینہ ہے۔ یہ کتاب معلومات افزا ہونے کے باعث ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔مقدمہ میں اہم داستانوں نو طرز مرصع ،باغ وبہار،اور فسانہ عجائب کے متعلق تحقیقی وتنقیدی مباحث ضبط تحریر میں لائے گئے ان مباحث میں داستانوں کے ماخذ ،تراجم اور اُن کی تاریخی ولسانی اہمیت واضح کی گئی ہے۔مقدمہ میں علی جاوید باغ وبہار کے متعلق رقم کرتے ہیں۔

''باغ وبہار صرف ایک داستان نہیں۔ یہ کتاب برصغیر کی ہزار سالہ تہذیبی وثقافتی تاریخ کا
ایک زندہ جاوید نقش ہے۔اس میں اس طرز احساس کی کارفرمائی موجود ہے جو صوفیانہ روایات ،
روحانی واخلاقی اقدار اور جمالیاتی شعور کی اس ہم آہنگی سے عبارت ہے جو صدیوں کے تہذیبی
عمل کے روحانی اور تخلیقی وتخیلی وراثت کا حاصل ہے۔ یہ ایک نشاطیہ معاشرے کی متحرک تصویر
ہے۔''۲۸

قمر الہدیٰ فریدی کی تصنیف اُردو داستان تحقیق و تنقید میں تنقید کے ساتھ تحقیقی مباحث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر اس کتاب میں تحقیقی رنگ غالب نظر آتا ہے۔اس میں داستانوں پر جو تنقید ملتی ہے اس سے صحت مند تنقید کی روایت ضرور قائم ہوتی ہے ۔اُردو کی اہم نثری داستانوں پر تنقیدی مباحث معرض تحریر میں لائے گئے۔فسانہ عجائب کے اُسلوب کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

''ایک لمبی داستان میں شروع سے آخر تک اس صناعانہ اسلوب کا برتنا اور قصّہ گوئی کے فرائض
سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ۔اور یہ بات بھی نشان خاطر رہے کہ اس طرزِ نگارش نے ایک
دبستان کی نمائندگی کی ہے۔''۲۹

ڈاکٹر سعید احمد کی تصنیف داستانیں اور حیوانات اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد کام ہے ۔کیونکہ انہوں نے داستانوں کے جس پہلو کو موضوع تنقید بنایا ہے یہ کسی حد تک تشنہ ہی تھا۔اس میں فورٹ

ولیم کالج کی مختصر اور طویل داستانوں سے علامتی معنویت کے لحاظ سے جانوروں اور پرندوں کی مثالیں سامنے لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔اُردو ادب کی معروف داستان باغ و بہار میں بھی اہم حیوانی کردار خواجہ سگ پرست کا کتا ہے۔خواجہ کے دونوں سگے بھائی خواجہ کو کنویں میں گراتے ہیں تو کتا خواجہ کی جان بچاتا ہے ۔ یہ کتا اپنے مالک کو بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگاتا ہے۔خواجہ کا بیان ہے

''اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا۔۔۔ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا،آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا میرے ساتھ یہ بھی کودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹتا چلا جاتا تھا ۔میں نے اس کی دُم پکڑ لی۔اللہ نے اس کو میری زندگی کا سبب کیا۔''۳۰

شہناز کوثر کی تنقیدی کاوش اُردو داستانوں کے منفی کردار (آغاز سے۱۸۱۰ءتک)"میں منفی کرداروں سے متعلق قدیم و جدید تصّور پیش کیا گیا۔ عالمی ادب میں منفی کرداروں کے جائزہ کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔اوراُردو کی اہم داستانوں سے منفی کردار سامنے لائے گئے۔عالمی داستان کے کرداروں میں کئی طرح کے منفی رجحانات منظر عام پر لائے گئے اس کتاب میں کردار نگاری کا منفرد پہلو واضع کیا گیا۔اس سے ثابت ہوا کہ داستانوی ادب کی یہ ماورائی دنیا اپنے اندر معانی اور مطالب کے جانے کتنے جہاں معنی رکھتی ہے۔اس کتاب کا مطالعہ منفی کرداروں کی تفہیم کے لئے مفید ہے۔

بیتال پچیسی تہذیبی مطالعہ میں حمیرا رفیق نے تہذیب کے عناصر ترکیبی فرداً فرداً بیان کیے ہیں ۔مصنف (مظہر علی ولا) کے سوانحی کوائف بیان کرنے کے علاوہ تہذیبی مطالعہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔آخری باب کے آغاز میں راجاؤں ،رانیوں،شہروں، پرندوں اور خوشبوؤں کے نام تحریر کیے ہیں۔سامان آرائش کا ذکر کرتے ہوئے خوشبوؤں کے نام واضح کیے گئے ہیں۔مثلاً''ایک طرف سیج پھولوں کی بچھی ہے۔اپنے اپنے قرینے سے عطر دان، پاندان، چنگیریں، چوگھرے آراستہ کئے ہوئے دھرے ہیں۔چوا، چندن،ارگجا، کستوری، کٹوریوں میں بھرا ہوا دھرا ہے''ڈاکٹر طاہر تونسوی بیتال پچیسی کا تہذیبی مطالعہ''کے عنوان سے تحریر کیے ہوئے باب کو کتاب کا صدر دروازہ قرار دیتے ہیں۔ ''پیش لفظ'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے حمیرا رفیق کی تصنیف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''حمیرا رفیق نے روایتی انداز میں محض داستان کے خواص اور خوبیاں شمار کروانے کی روایات

سے ہٹ کر، بتیال پچیسی کا تہذیب وکلچر کے تناظر میں لا یا گیا جائزہ قابل توجہ اور قابل تحسین ہے۔''۳۱

ڈاکٹر سہیل عباس خان کی کاوش ''باغ و بہار میر امن دہلوی: تحقیق وتنقید "۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں باغ و بہار کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ اور دوسرا حصہ باغ و بہار کے متن پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں رشید حسن خان کے مرتب کردہ متن کو تحقیق وتنقید کے ذیل میں لا یا گیا ہے۔ اس میں تنقید کے عملی مباحث زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے سہیل عباس خان کی تازہ کاوش کو سراہا ہے ۔انوار احمد کا خیال ہے۔

''سہیل عباس نے اپنے بے مثل کام سے مجھے حیران کر دیا۔ اس کا متعدّد محاسن کا حامل تخلیقی ذہن اسے داستان کا ماورائی نہیں تو مثالی کردار ضرور بنا دیتا ہے۔''۳۲

ڈاکٹر سعید احمد کی کتاب" داستانیں اور تصور خیرو شر " ۲۰۱۶ء میں چھپی۔ پہلے باب میں تصور خیر وشر ادیان عالم کے تناظر میں واضح کیا گیا۔فورٹ ولیم کالج کے تحت تصنیف وتالیف کی گئی داستانوں (توتا کہانی ،آرائش محفل ،باغ و بہار، بیتال پچیسی اور مذہب عشق) میں تصور خیر وشر بلحاظ کردار نمایاں کیا ہے ۔ڈاکٹر موصوف "مذہب عشق" میں خیر وشر کے عناصر سامنے لاتے ہیں۔ پوری داستان میں معاملات حسن وعشق کا بیان ہے ۔مگر ان واقعات کے پسِ منظر میں خیر وشر کی قوتیں کارفرما ہیں۔ ابتداء میں بادشاہ زین الملوک کے پانچویں بیٹے تاج الملوک کی پیدائش کے ساتھ ہی شر کی شیطانی طاقتیں سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔ بادشاہ اپنے لخت جگر کے دیدار سے محروم ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر سعید احمد مذہب عشق کے کرداروں کے متعلق رقم طراز ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں خیر وشر کے حوالے سے "مذہب عشق " کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ''مذہب عشق'' کی کہانی حقیقت اور مجاز کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ مذہب عشق کے حامل خیر کرداروں میں شہزادہ تاج الملوک کا کردار مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ اشرار کرداروں میں زین الملوک اور چاروں شہزادوں کے کردار نمایاں ہیں۔ مذہب عشق میں خیر وشر کی جنگ خیر کی فتح پر منتج ہوتی ہے۔''۳۳

ڈاکٹر سعید احمد کی کاوش "داستانیں اور تصور خیر و شر" داستانوی تنقید کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خصوصی قدر و قیمت کی حامل ہے۔اس کے مطالعہ سے محققین و ناقدین کی تفہیم کے نئے دریچے کھلتے ہیں۔

اردو داستان پر تنقید کی تاریخ زیادہ طویل نہیں لیکن ۱۹۴۴ء سے اس صنف کی تنقید میں وقیع اضافے ہو چکے ہیں آج اردو داستان پر تنقید کا دامن متنوع لحاظ سے مالامال ہو چکا ہے۔اس سیر حاصل بحث میں اردو داستان پر اڑتیس تنقیدی کتب کا اجمالی تعارف کروایا گیا ہے۔ان کتب میں فنی،کرداری،تہذیبی اور بالخصوص نظری و عملی مباحث پر تنقید ملتی ہے۔ان میں سے کلیم الدین احمد اور سید وقار عظیم کی تصانیف خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ کلیم الدین احمد اردو زبان اور فن داستان گوئی نیشنل بک فاؤنڈیشن،لاہور۱۹۹۰ء،ص۸

۲۔ گیان چند جین اُردو کی نثری داستانیں انجمن ترقی اُردو پاکستان،کراچی۲۰۱۴ء،ص۶۴

۳۔ سید وقار عظیم ہماری داستانیں الوقار پبلی کیشنز،لاہور۲۰۱۲ء،ص۳۲۰

۴۔ وحید قریشی باغ و بہار:ایک تجزیہ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور۱۹۶۸ء،ص۹۹-۹۸

۵۔ سلیم اختر (مرتبہ) دلی والے میرامن کی باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ،مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۶۸ء ص ۲۵۹

۶۔ احسان الحق اختر سب رس کا تنقیدی جائزہ،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۱۹۶۸ء،ص۴۶ -۴۵

۷۔ زہرا معین باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور ۱۹۸۵ء، پشت فلیپ

۸۔ ارتضیٰ کریم عجائب القصص تنقیدی مطالعہ زلالہ پبلی کیشنز،دہلی ۱۹۸۷ء، پشت فلیپ

۹۔ سہیل بخاری اُردو داستان (تحقیق و تنقید) مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۷ء،ص۱۲

۱۰۔ سہیل احمد خان (مرتبہ) داستان در داستان قوسین،لاہور،۱۹۸۷ء ص ۳۷

۱۱۔ سہیل احمد خان داستانوں کی علامتی کائنات''،مشمولہ مجموعہ سہیل احمد خان سنگ میل

پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء ص ۱۶۱

۱۲۔ شفیق احمد شفق اُردو داستانوں میں ویلن کا تصور نشاط آفسٹ پریس، فیض آباد ۱۹۸۸ء ص ۱۱

۱۳۔ آغا سہیل دبستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقاء مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۲۱۱

۱۴۔ آرزو چودھری داستان کی داستان عظیم اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء ص ۱۳

۱۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر داستان اور ناول سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء ص ۸۱

۱۶۔ رفیع الدین ہاشمی سرور اور فسانہ عجائب سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۶۶

۱۷۔ ڈاکٹر عفت زریں فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں - ایک تہذیبی مطالعہ " کتابی دنیا، دہلی ۱۹۹۲ء ص ۲۰۵

۱۸۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش داستانیں اور مزاح مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۳ء ص ۸۷

۱۹۔ ڈاکٹر آرزو چودھری عالمی داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) عظیم اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۵ء ص ۹

۲۰۔ صغیر افراہیم نثری داستانوں کا سفر اور دوسرے مضامین ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء ص ۸۳ - ۸۲

۲۱۔ ڈاکٹر شاہد حسین قصہ مہر افروز و دلبر تنقیدی و تہذیبی تجزیہ شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی ۱۹۹۸ء ص ۱۴۴ - ۱۴۳

۲۲۔ ڈاکٹر مظفر عباس اُردو کی زندہ داستانیں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۹ء، پشت فلیپ

۲۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی ساحری، شاہی، صاحب قرانی، داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول نظری مباحث قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۳۷

۲۴۔ صغیر افراہیم نثری داستانوں کا سفر اور دوسرے مضامین ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء ص ۸۰ - ۷۹

۲۵۔ ڈاکٹر ابن کنول داستان سے ناول تک بھارت آفسٹ پریس، دہلی ۲۰۰۱ء ص ۱۹۳ - ۱۹۲

۲۶۔ سید ضمیر حسن دہلوی فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ ایم - آر - پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۷ء ص ۱۱۴

۲۷۔ سید وقار عظیم داستان سے افسانے تک الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء ص ۲۰-۱۸

۲۸۔ علی جاوید (مرتب) اُردو کا داستانوی ادب اُردو اکادمی، دہلی ۲۰۱۱ء ص ۳

۲۹۔ قمر الہدیٰ فریدی اُردو داستان (تحقیق و تنقید) الوقار پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء ص ۲۲۰

۳۰۔ ڈاکٹر سعید احمد داستانیں اور حیوانات مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۱۲ء ص ٦۴

۳۱۔ حمیرا رفیق بیتال پچیسی تہذیبی مطالعہ مع فرہنگ شمع بکس، فیصل آباد ۲۰۱۴ء، ص ۳

۳۲۔ سہیل عباس خان باغ و بہار میرامن دہلوی (تحقیق و تنقید) بیکن بکس، ملتان ۲۰۱۴ء، ص ۲

۳۳۔ ڈاکٹر سعید احمد داستانیں اور تصور خیر و شر مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۱٦ء، ص ۱۵۳-۱۵۲